قسط دُوازدہم

آدھی صدی کا سفر

مکرم عرفان احمد خان صاحب۔ جرمنی

پچاس پچپن سال قبل جرمنی میں شدید سردی پڑتی تھی۔ ماہ اکتوبر سے مارچ تک لوگ سورج دیکھنے کو ترستے تھے۔ ان چھ ماہ میں اگر کسی دن سورج نکل آتا تو لوگ کام کاج چھوڑ کر دھوپ کی تپش سے لطف اندوز ہوتے۔ شدید سردی اور برف باری کے باوجود کاروبارِ زندگی پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا۔ سکول بھی وقت پر لگتے اور منہ اندھیرے بچے سکولوں کو رواں دواں نظر آتے۔ ایک تو شدید سردی اور اوپر سے چھ سات گھنٹے کا دن۔ صبح کی پو پھٹنے یا دن کے ڈھلنے کا تصوّر موسم سرما میں تو نہیں تھا اور یہ بات میرے لئے حیران کن تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس زندگی کا عادی ہو گیا۔ لیکن اب جرمنی میں اپنے ابتدائی زمانہ (جو بڑی بے سروسامانی کے عالم میں گزرا) کو یاد کرتا ہوں تو سر بارگاہِ ایزدی میں جھک جاتا ہے کہ اس ذات نے قدم قدم پر میری مدد اور راہنمائی کی اور مشن ہاؤس کی موجودگی نے ہمیں کبھی بے سہارا نہ رہنے دیا۔

پریکٹیکم (Praktikum) کا آغاز

جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ جرمنی میں سکونت اختیار کرنے کا راستہ سٹوڈنٹ ویزا تھا۔ ایک سال زبان سیکھنے کے بعد ویزا کی میعاد میں توسیع کروانے کے لئے گریجویٹ کو یونیورسٹی اور نان گریجویٹ کو اپرینٹس شپ میں داخلہ لینا پڑتا تھا۔ اپرینٹس شپ کو جرمن زبان میں پریکٹیکم کہتے ہیں جس کی تلاش میں مدد فراہم کرنے کے لئے ایک سوشل مدد کا دفتر تھا۔ اس کے انچارج ڈاکٹر کلاوز انٹرویو کرنے کے بعد ایک تعارفی خط دے دیتے تھے۔ میرا ویزا مارچ میں ختم ہو رہا تھا جس کی جرمن زبان سیکھنے کی بنیاد پر میعاد بڑھانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ دوسرا راستہ ڈاکٹر کلاوز کے دفتر کا تھا۔ میں نان ٹیکنیکل ذہن کا مالک تھا اس لئے مکرم انوری صاحب نے مشورہ دیا کہ میں ہوٹل مینجمنٹ میں پریکٹیکم کرلوں۔ اس سے قبل مکرم ملک مسیح الدین شاہد صاحب، مکرم رفیق احمد صاحب ابن مکرم ڈاکٹر رمضان احمد صاحب اور مکرم رفیق احمد صاحب آف لاہور اس پروفیشن سے وابستہ ہو چکے تھے۔ میں بھی ڈاکٹر کلاوز کے دفتر میں حاضر ہو گیا اور ان کا تعارفی خط لے کر اپنی قسمت آزمانے نکل کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر کلاوز نے خط جاری کرتے وقت ایک نصیحت کی تھی کہ فائیو سٹار ہوٹل میں پریکٹیکم تلاش کرنا۔ چھوٹے ہوٹل والوں کی دلچسپی آپ کو کام سکھانے میں کم اور اپنا کام نکلوانے میں زیادہ ہو گی۔ میں اس وقت فائیو سٹار کی پہچان سے ناواقف تھا۔ والد صاحب کی نصیحت کے مطابق ڈاکٹر کلاوز سے ملاقات کا احوال مکرم فضل الٰہی انوری صاحب سے بیان کر دیا۔ اس زمانہ میں فرانکفرٹ میں صرف دو فائیو سٹار ہوٹل تھے۔ انٹر کانٹینینٹل اور Steigenberger Frankfurter Hof۔ ایک فور سٹار ایئر پورٹ ہوٹل تھا۔ فرانکفرٹ ہوف کا شمار دنیا کے دس نامور ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ میں نے وہاں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اپلائی کرنے، درخواستیں لکھنے سے میں ناواقف تھا۔ یہ بات بھی میرے علم میں نہ تھی کہ بڑی کمپنیوں میں Personal آفس ہوتا ہے جہاں ملازمت کے لئے درخواست دی جاتی ہے۔ میں سیدھا ہوٹل کے ریسیپشن پر جا پہنچا اور ڈاکٹر کلاوز کا خط ریسپشنسٹ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے فون پر کسی سے بات کی اور چند منٹ میں ایک خاتون نے آکر مجھے اپنے دفتر میں چلنے کو کہا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ راہداریوں سے گزرتے وقت میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں میری پہلی انٹری تھی اور قدرت میرے والدین کی دعاؤں کے طفیل مجھ پر مہربان ہونے جا رہی تھی۔ پہلی منزل پر دفتر میں پہنچ کر مسٹر میولر نے میرا انٹرویو کیا اور آخر پر خوشخبری سنائی کہ کل آکر معاہدہ پر دستخط کر دینا۔

پہلے قدم پر اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے فضل پر سجدہ شکر ادا کیا۔ باہر آکر ٹیلیفون بوتھ سے مکرم انوری صاحب کو اطلاع دی تو انہوں نے سیدھا مشن ہاؤس آنے کو کہا۔ میرے مشن ہاؤس جانے پر وہ بھی اس خوشی میں شریک ہوئے۔ فرانکفرٹ ہوف کا معاہدہ 15 مارچ سے شروع ہو رہا تھا جس کی بناء پر مجھے دو سال کا جرمنی میں قیام کا ویزا مل گیا اور دو فکروں سے آزادی ملی، فالحمدللہ۔ یہاں مَیں 8 سال رہا۔ اس دوران امریکہ اور دنیا کے دیگر ممالک کے صدرانِ مملکت کو دیکھنے اور کویت کے امیر صباح السالم الصباح کو ان کی خواہش پر سروس دینے کا موقع ملا۔ اپنی ہمشیرہ کی بیماری کی وجہ سے شاہی خاندان نے بیس روز اس ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ مَیں نے ان 8 سالوں میں بہت کچھ سیکھا۔ سب سے بڑھ کر یہاں ٹھہرنے والے سیاسی قائدین کو سروس دینے سے میرے میں جو اعتماد پیدا ہوا وہ بقیہ زندگی میں میرے بہت کام آیا۔ بعض واقعات کا ذکر آئندہ اقساط میں اپنے موقع پر آتا رہے گا۔

پر آشوب حالات کا سامنا

ابھی پریکٹیکل لائف شروع ہوئے دو ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ مئی 1974ء میں پاکستان میں ایک تحریک کی صورت میں احمدیوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جس کی تفصیل متعدد جگہوں پر چھپ چکی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اطلاعات اور خبریں حاصل کرنے کے ذرائع بہت محدود تھے۔ ڈائرکٹ ڈائلنگ سسٹم بھی موجود نہ تھا۔ بیرون پاکستان رہنے والے احمدی حد درجہ پریشان اور خبریں جاننے کے لئے بے چین رہتے۔ ہم جو چند احمدی فرانکفرٹ میں تھے مشن ہاؤس میں جمع رہتے۔ دعائیں بھی کرتے اور اپنی پریشانی ایک دوسرے سے شیئر کرتے۔ مکرم انوری صاحب بار بار لندن فون کرتے کہ وہاں مشن ہاؤس کا پاکستان سے رابطہ نسبتاً آسان تھا۔ ان ایام میں نمازوں میں سوز و گداز، سجدوں میں احباب کا خدا کے حضور بلکنا تاریخ کا حصہ ہے۔ ہم زیادہ تر نوعمر تھے۔ ہم میں سب سے سینئر مکرم محمد اسمٰعیل خالد صاحب تھے جن کو دنیا اسمٰعیل بٹوہ کے نام سے جانتی ہے۔ انہوں نے 1953ء کے فسادات لاہور میں ڈیوٹیاں دی تھیں۔ وہ اس دور کے خدائی مدد کے واقعات سنا کر ہم نوجوانوں کے حوصلے بلند رکھتے۔ ان ایام میں ہم پر جو گزر رہی تھی اس میں محمد اسمٰعیل خالد صاحب مرحوم ہماری ڈھارس بندھاتے رہے۔

سفیر پاکستان کی نور مسجد میں آمد

جیسا کہ مَیں نے بتایا کہ 15 مارچ سے مَیں نے پریکٹیکم شروع کر دیا تھا۔ جون کی ابتدائی تاریخ تھی کہ میں صبح کام پر گیا تو ہوٹل کے مین گیٹ پر پاکستان کا قومی پرچم لہرا رہا تھا۔ مَیں نے اندر جا کر معلوم کیا تو پتہ چلا سفیر پاکستان ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ سید سجاد حیدر صاحب ایک سال سے بھی کم عرصہ پہلے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ سے ملنے نور مسجد تشریف لا چکے تھے۔ مَیں نے ان سے ہوٹل میں ملنے کی کوشش کی۔ ان کے ساتھ کمرشل قونصلر سعید احمد خان صاحب بھی تھے۔ انہوں نے میرا پیغام سفیر صاحب تک پہنچایا تو سید سجاد حیدر صاحب ہوٹل کی لابی میں تشریف لے آئے اور ان سے پاکستان میں احمدیوں پر گزرنے والے حالات کا جو علم مجھے تھا وہ مَیں نے بیان کر دیا۔ اس سے پہلے ان کے پاس سرکار کی بھجوائی ہوئی معلومات ہی تھیں جس میں احمدیوں کے ہونے والے نقصان کا ذکر نہیں تھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس وقت سفیر پاکستان کو یہ باور کروانے کی بھی توفیق دی کہ ہم اپنے ملک میں ظلم کا شکار ہو رہے ہیں اور آپ نے بطور سفیر خود فون کر کے ہم سے اظہار ہمدردی نہیں کیا۔ انہوں نے جواباً کہا کہ مجھے اس تفصیل کا علم نہیں تھا۔ دو روز بعد سفیر صاحب کا انوری صاحب کو فون آیا کہ میں اتوار کے روز آپ کے پاس آ کر کمیونٹی کے افراد سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اتوار کے روز ہم سب مشن ہاؤس میں موجود رہے اور سفیر پاکستان سید سجاد حیدر صاحب نے خطاب کر کے اپنی طرف سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ابھی قومی اسمبلی میں بحث شروع نہ ہوئی تھی اور فسادات جاری تھے اس لئے سجاد حیدر صاحب کا رویہ بھی بہت ہمدردانہ رہا۔ جماعت کی طرف سے صرف مکرم فضل الٰہی انوری صاحب مشنری انچارج نے گفتگو کی۔ چائے کے دوران سفیر صاحب نے جماعت کے نظم و ضبط کی تعریف کی۔ ان کے الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں کہ ’’مجھے یوتھ ہوسٹل کے ہال میں جب بھی پاکستانیوں سے خطاب کا موقع ملا ہے گلے شکوے اور الزام تراشی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مَیں آج اسی ماحول کا سامنا کرنے کی تیاری کر کے آیا تھا۔ لیکن آپ لوگوں نے بہت تحمل سے مجھے سنا ہے اور کوئی احتجاجی فقرہ آپ کی زبان پر نہیں آیا۔ حالات کو بدلنا میرے اختیار میں نہیں لیکن میری دعا آپ کے ساتھ ہے۔ اللہ آپ کی مدد کرے‘‘۔ سفیر صاحب دو گھنٹے سے زائد نور مسجد سے ملحقہ ہال میں احمدیوں سے گفتگو کرتے رہے۔ یہ بہر حال ان کی شرافت تھی کہ انہوں نے نور مسجد آنا ضروری سمجھا۔

احتجاجی خطوط کا تذکرہ

چیف منسٹر پنجاب حنیف رامے کی سرگودھا میں موجودگی کے روز احمدیوں کی املاک کو جس طرح لوٹا گیا اور اس سے پہلے بھی احمدیوں کے خلاف جاری تحریک کے دوران مختلف جگہوں پر احمدیوں کو مال و جان کی جو قربانی دینی پڑی اس پر مرکز سے یہ ہدایت آئی کہ اس زیادتی کے خلاف وزیر اعظم پاکستان اور اپنے اپنے ملک میں پاکستانی سفارت خانوں کو احتجاجی خط لکھے جائیں۔ چنانچہ جرمنی کے احمدیوں نے بھی اس سکیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعض افراد خط کے نفسِ مضمون سے نابلد تھے ان کو خطوط لکھ کر دینے کی خدمت بھی بعض افراد نے سرانجام دی۔ اس سلسلہ میں مکرم رفیق سلطان صاحب ابن مکرم بدر سلطان اختر صاحب مراقب خدام الاحمدیہ نے اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ نئے نئے پاکستان سے آئے تھے اور وہاں نیشنل بنک کراچی میں ملازمت کی وجہ سے انگریزی اور اردو ڈرافٹنگ میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ روزانہ صبح فرانکفرٹ کے مرکزی شاپنگ سنٹر Zeil میں موجود مرکزی ڈاکخانہ Hauptpostamt میں جا کر بیٹھ جاتے اور جس نے خط لکھوانا ہوتا وہ اس دوست کو خط لکھ کر دے دیتے جو اسی وقت وہیں سے پوسٹ کر دیا جاتا۔ کمرشل قونصلر مکرم سعید احمد خان صاحب نے مجھے خود بتایا کہ آپ لوگوں کی طرف سے آنے والے خطوط اسلام آباد میں وزارت خارجہ کو بھجوا دیے جاتے تھے۔ اس زمانہ کا Zeil کا علاقہ آج سے بہت مختلف تھا۔ ایک تو وہاں دو طرفہ ٹریفک چلتی تھی اور درمیان میں ٹرام کی پٹڑی تھی۔ دونوں طرف ڈیپارٹمنٹل سٹور اور دوکانیں تھیں جن کے آگے بہت چوڑا فٹ پاتھ تھا جس کے سرے پر ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ مرکزی پوسٹ آفس میں ایک طرف بیس سے زیادہ کاؤنٹر تھے۔ ایک حصہ میں انٹرنیشنل ٹیلیفون ایکسچینج تھا جہاں بکنگ کروا کر فون کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے حصہ میں جرمنی میں کال کرنے کے بے شمار بوتھ لگے ہوئے تھے۔ اب موبائل کا استعمال اتنا عام ہے کہ 70 کی دہائی کے شروع کے سال میں رائج الوقت طریق کار پر اب ہنسی آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ 70 کی دہائی کے آخری سالوں اور پھر 80 کی دہائی میں جرمنی نے بہت تیزی سے ترقی کی۔

جرمنی میں اسائلم کے ابتدائی حالات آئندہ قسط میں پیش کئے جائیں گے۔